اگر میں طبیب ہوتا

ڈاکٹر میر ولی الدین
ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لا
پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد

ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

اگر میں طبیب ہوتا

اِس کتابچہ میں یہ نفسیاتی حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ہماری اکثر بیماریاں، ہماری نفرت، ہمارے خوف اور ہمارے بُرے خیالات کی وجہ سے ہوتی ہیں، جنھیں دُور کرکے ہم اپنی ہر بیماری اور تکلیف کا خود ہی نفسیاتی علاج کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر میر ولی الدین۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)

بیرسٹرایٹ لا۔ پروفیسر فلسفہ۔ جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد

شائع کردہ

ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

طبع اوّل
فروری ۱۹۶۰ء

مطبوعہ دتی پرنٹنگ ورکس۔ دہلی

اگر میں طبیب ہوتا اور کسی مریض کے علاج کے لیے بُلایا جاتا تو میں محض دواؤں کے ذریعہ اس کا علاج نہیں کرتا، بلکہ کچھ اور طریقوں سے بھی اس کی مدد کرتا اور اس کے مرض کو دفع کرنے کی کوشش کرتا۔ بہت ساری بیماریاں پوشیدہ مصروفِ عمل ذہنی اور جذباتی علل و اسباب کے خارجی معمولات اور نتائج ہوتی ہیں، اس لیے اگر مریض کا اعتماد مجھ کو حاصل ہو تو میں اس سے چند ضروری سوال کروں:

(۱) پہلا سوال تو یہ ہوگا کہ "کیا تم کو کسی سے نفرت ہے، یا تم کسی کو ناپسند کرتے ہو، یا تم کو کسی سے ضرر پہنچا ہے، جس کا صدمہ اب بھی تمہارے قلب میں باقی ہے اور وہ اس صدمے سے پُرخون ہے؟"

یہ سوال میں اس لیے کرتا کہ اگر اس مریض کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ اپنے پُرانے زخموں کو چاٹا کرتا ہے، گزشتہ تلخیوں کو تازہ کرتا رہتا ہے اور "بُغض و عداوت" سے لُطف اندوز ہوا کرتا ہے تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ اپنے نظامِ عضویت میں زہر کی پچکاریاں لگایا کرتا ہے، اپنے نظامِ عصبی کو فولادی ہتھوڑوں سے پاش پاش کیا کرتا ہے اور اپنی صحتِ جسمانی کا خود دشمن ہے۔ بہتوں کے لیے تو یہ عجیب و غریب سی بات ہے کہ انسان اپنی نفرت و عداوت کی خود سزا پاتا ہے، کیوں کہ اکثر لوگ اس نفسیاتی صداقت سے جہل رکھتے ہیں کہ جسمانی صحت پر جذبات کا قوی اثر ہوتا ہے، تاہم ان کے عدمِ علم سے اس صداقت کا عدمِ وجود لازم نہیں آتا۔ یہ ایک کُلّی اور ضروری صداقت ہے اور اس کی بے شمار شہادتیں ہمیں روزمرہ کی زندگی میں ہر قدم پر ملتی ہیں۔ کسی ایسے شخص کا خیال کرو، جو دوسروں سے نفرت کرتا ہے اور اس کا سینہ اُن کے خلاف غیض و غضب سے بھرا ہوتا ہے، جو اپنے ضرر اور نقصان کو یاد کر کے غم کھایا کرتا ہے، جو اپنا انتقام لینا چاہتا ہے اور اس کے متعلق سوچا کرتا ہے۔ اب خود اپنے نفس سے سوال کرو۔ کیا یہ شخص صحت مند، خوش، بے فکر ہے یا تُرش رو، بدمزاج، غمگین اور کُہنہ بیماریوں میں مُبتلا، یا اعصابی امراض کا شکار ہے۔ کیا تم نے کسی ایسے شخص کو تندرست، توانا،

قوی اور لذتِ حیات سے متلذذ پایا۔ کبھی نہیں، کیوں؟، اس لیے کہ وہ کائنات کے غیر متغیر کُلّی قوانین کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ وہ کو بناتی نظام سے ٹکرا رہا ہے۔ اس کو تو وہ توڑ نہیں سکتا، خود ٹکڑے ہو رہا ہے۔ زندگی کا ازلی و ابدی قانون تو محبت ہے، کائنات کو جس قانون سے قیام و بقا حاصل ہے وہ محبت کا قانون ہے۔ صحت و مسرت کی سب سے قوی ضامن محبت ہی ہے اور جُملہ علتوں کی دوا محبت ہی ہے:

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما

اے طبیبِ جُملہ علت ہائے ما (رومی)

میں نے اپنے ایک ساتھی کو اعصابی مرض میں مُبتلا پایا۔ علاج میں وہ کسی قسم کی غفلت نہیں کرتا تھا، لیکن اس کا مرض بڑھتا ہی گیا۔ گفت گو سے مجھے شُبہ ہوا کہ وہ کینہ پرور طبیعت رکھتا ہے اور ایک شخص سے اس کو بڑی نفرت ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ جب تک تم اس شخص کو حسبۃً للّٰہ معاف نہ کر دو گے اور اس کی طرف سے بالکل سلیم الصدر نہ ہو جاؤ گے، تمہارا یہ مرض کبھی نہ جائے گا۔ بڑی کشمکش کے بعد وہ اس قابل ہوا اور چند روز میں اس کی صحت اچھی ہو گئی۔

صوفیائے کرام کا یہی طریقہ رہا ہے۔ عام لوگ تو ظلم کی پاداش میں ظلم کرتے ہیں اور ظالم سے نفرت کرتے ہیں۔ کسی کی خطا معاف نہیں کرتے اور اپنا بدلہ بہر حال لینا چاہتے ہیں۔ عفو و صفح کا قانون اُنھوں نے پڑھا ہی نہیں اور جان کر بھی اس پر ایمان نہیں لاتے، لیکن درویش نیکوں کے ساتھ تو بھلائی کرتے ہی ہیں، وہ بدوں کے ساتھ بھی بھلائی کرتے ہیں۔ شاہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے:

ہر کہ مارا رنجہ دارد راحتش یار باد — وآنکہ مارا خوار دارد ایزد اورا یار باد

ہر کہ او خارے نہد در راہِ من از دشمنی — ہر گلے کو باغ عمرش بشگفد بے خار باد

وجدانی علم کے ذریعہ ان درویشوں نے یہ حقیقت سمجھ لی تھی کہ انسان کا قلب یا ذہن ہی اس کے سارے حالات و کیفیات کا مبدا ہے اور اس کے افکار و خیالات ہی اس کی حقیقت ہیں۔ مولانا روم نے اس ازلی صداقت کو اپنے الفاظ میں یوں پیش کیا تھا:

اے برادر تو ہمیں اندیشہ — مابقی استخوان و ریشہ

گرگُل است اندیشہ تو گلشنی   در بود خارے تو ہمہ گلخنی

یعنی انسان کی حقیقت اُس کے اپنے خیالات ہیں۔ ان کے علاوہ انسان میں جو کچھ ہے وہ زاید فضول ہے۔ جیسی حقیقت ویسا ظہور۔ اگر خیالات میں پھُول کی سی لطافت اور خوشبو ہے تو انسان ہی سرتاپا گلشن ہے اور اگر ان میں کانٹوں کی سختی اور کثافت ہے تو وہ سراسر گلخن ہے۔

قلب میں عداوت، نفرت، بغض وانتقام کے خیالات کو جگہ دینا، جسم میں آگ کو بھڑکانا ہے اور اس گلخن، یا بھٹی میں کود پڑنا ہے۔ اس طرح قلب میں اُنس ومحبّت کو جگہ دینا، عفوودرگذر، مروّت ورعایت، حلم وکرم کے پھُولوں سے اس کو آراستہ کرنا اس زندگی ہی میں "جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ" کا لُطف حاصل کرنا ہے۔

مجھے صحت کے لیے اس سے زیادہ مفید نسخہ نہیں معلوم کہ ہر روز شام میں تھوڑا سا وقت نکال لیں اور "مراقبۂ حب" کیا کریں، یعنی جن سے بھی ہمیں اذیّت یا نقصان پہنچا ہے، یا جن سے ہمیں نفرت یا عداوت رہی ہے، ان سب کو حسبۃً للّٰہ معاف کردیں اور ان کے حق میں دعا کریں کہ حق تعالیٰ انہیں ظلمت سے نکال کر نُور کی طرف ان کی رہنمائی کریں اور اپنی نعمتوں سے سرفراز کریں۔

قرآنِ حکیم نے بھی اسی عمل کی طرف اشارہ کیا ہے:

وَلَا يَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ
اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَ
بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا
الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (پ۲۴ ع۱۹)

اور برابر نہیں نیکی اور نہ بدی۔ جواب میں وہ کہہ جو اس سے بہتر ہو پھر تو دیکھ لے کہ تجھ میں اور جس میں دشمنی تھی، گویا دوست دار ہے قرابت والا، اور یہ بات ملتی ہے ان ہی کو جو سہار رکھتے ہیں اور یہ بات ملتی ہے اس کو جس کی بڑی قسمت ہے۔

یہاں بھی بُرائی کا جواب بھلائی سے دینے کی تلقین کی جارہی ہے اور اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ بتلایا جارہا ہے کہ سخت سے سخت دشمن بھی ڈھیلا پڑ جائے گا اور ممکن ہے کہ سچے دل سے دوست بن جائے اور دشمنی وعداوت کے خیالات یکسر قلب سے نکل جائیں۔ "ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ" یا بڑی قسمت والوں کا ہمیشہ یہی طریقہ رہا ہے۔ اُنہوں نے بدی کا جواب ہمیشہ نیکی سے دیا ہے:

ما عادتِ خود بہانہ جوئی نہ کنیم   جُز راست روی و نیک خوئی نہ کنیم

آنہا کہ بجائے ما بدیہا کردند   گردست رسید بجز نکوئی نہ کنیم

(حضرت شاہ نعمت اللہ دلی)

"قلبِ سلیم" وہی قلب ہے جو کینہ اور غضب سے تہی ہو اور اللہ اور "عیال اللہ" کی محبت سے پُر۔ ذرا قوت کے ساتھ اس خیال کو اس طرح ادا کیا گیا ہے:

گیرم کہ نماز ہائے بسیار کنی   در روزہ دہر بے شمار کنی!

تا دل نہ کنی زغصہ وکینہ تہی   صد من گُل بر سرِ یک خار کنی

یاد رکھو کہ محبت، موافقت و ہم آہنگی پیدا کرنے کی بڑی قوت رکھتی ہے۔ ساتھ ہی وہ نظامِ عصبی کو سکون و راحت سے بھر دیتی ہے، روح کو سکینت و طمانیت عطا کرتی ہے اور جسم کے ہر ذرہ کو حیاتِ نو کا پیغام دیتی ہے۔

ان ہی حقائق کی وجدانی یافت کی بنا پر صوفیا نے نصیحت کی ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ "نفس" سے پیش آئے تو تمہیں اس کے ساتھ "قلب" سے پیش آنا چاہیے۔ اس اجمال کی توضیح یہ ہے کہ نفس، خصومت، دشمنی، فتنہ اور غوغا سے لبریز ہوتا ہے اور قلب، سکون و اطمینان، مہر و رضا سے پُر ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص نفس سے پیش آتا ہے اور دوسرا اس کے مقابلہ میں قلب سے پیش آتا ہے تو پہلے شخص کا نفس مغلوب ہو جاتا ہے۔ مقہور ہو جاتا ہے اور اگر یہ بھی نفس کے مقابلہ میں نفس ہی سے پیش آئے تو دشمنی و عداوت، فتنہ و فساد کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، اسی لیے کہا گیا ہے:

زہر بادے چو کاہے گر بلندی   اگر کوہی بہ کاہے می نیرزی

صوفیا کی اس نصیحت کا ماخذ قرآنِ حکیم کی وہی آیت ہے، جس کا اوپر ذکر ہوا۔ "اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ"

یہ بھی یاد رکھو کہ دوسروں پر اعتراض، نکتہ چینی اور تنقید کرنا بھی ایک نہایت مُضر اور نقصان رساں عادت ہے اور "اعراض عن الاعتراض" ایک نہایت پسندیدہ خصلت۔ اعتراض و تنقید سے ایسے ذہنی ارتعاشات پیدا ہوتے ہیں کہ نظامِ عصبی تباہ ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ گھنٹوں وہ دوسروں کے عیبوں اور خامیوں پر بحث کرتے رہتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ایسا کرنے سے وہ اپنی صحت کو برباد کر رہے ہیں۔ اپنی زندگی کو ناشاد

بنا رہے ہیں اور ایک نہایت مہلک عادت کو پیدا اور پختہ کر رہے ہیں، جو اُن کی آنے والی زندگی کو تاریک اور تلخ کردے گی، اسی لیے حافظ نے کہا تھا کہ میری ایک نصیحت مان اور سو خزانوں سے مالا مال ہو جا۔ یعنی عیب بینی نہ کیا کر:

یک نصیحت کنمت بشنو و صد گنج ببر　　　از درِ عیش درآ دبرۂ عیب مپوش

روحانی معالجوں کو بارہا یہ تجربہ ہوا ہے کہ عیب بینی اور اعتراض کی عادت گٹھیا اور درد مفاصل پیدا کرتی ہے۔ اس سے دوسرے امراض بھی پیدا ہوتے ہیں اور قلب کا کارخانہ تو برباد ہی ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ دو آنکھیں باری تعالیٰ کی صنعتوں کو دیکھنے کے لیے دی گئی ہیں، اپنے بھائی کے عیبوں کو ٹٹولنے کے لیے نہیں دی گئیں:

دو چشم از پئے صنع باری نکوست　　　زعیب برادر فرد گیر دوست　　　(سعدی)

(۲) میرا دوسرا سوال یہ ہوگا "تمہیں خوف کن چیزوں سے ہے؟"۔ نفرت کے بعد خوف سب سے زیادہ مُہلک اور تباہ کن جذبہ ہے۔ یہ بھی نظامِ عصبی کو تباہ کر دیتا ہے اور صحت کو برباد اور یہ طمانیت و سکینتِ قلب کے حصول کو محال یا ناممکن بنا دیتا ہے۔ خوف ہی سے اضطراب اور پریشانی پیدا ہوتی ہے اور یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ جو لوگ پریشان رہتے ہیں وہ کبھی اچھے یا صحت مند نہیں رہتے۔ خوف اور پریشانی سے جسم کی قوّتِ مدافعت کم زور ہو جاتی ہے اور امراض کے حملوں کی راہ کُھل جاتی ہے۔ موجودہ علوم نے بھی اس واقعہ کی صداقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ جو لوگ بے خوف ہوتے ہیں، وہ چھوت کی بیماریوں میں مُبتلا نہیں ہوتے۔ نپولین کا قصّہ مشہور ہے کہ وہ طاعون زدہ مریضوں کے ہاں جاتا، تاکہ یہ ثابت کر دکھائے کہ بے خوف بہادر کو یہ مرض لگ نہیں سکتا اور وہ اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے میں کامیاب بھی ہوا۔ ہمارے ہاں یہ کہانی مشہور ہے کہ ایک حاجی کی ملاقات طاعون سے ہوئی اور اس نے دریافت کیا کہ کہاں کا قصد ہے؟ طاعون نے کہا کہ بغداد جا رہا ہوں اور وہاں پانچ ہزار کی جان لوں گا۔ کچھ دن بعد حاجی نے طاعون کو واپس ہوتے ہوئے دیکھا اور کہا کہ اے حضرت! آپ نے تو کہا تھا کہ بغداد میں صرف پانچ ہزار ہی کی جان کے قصد سے تشریف لے جا رہے ہیں، وہاں پہنچ کر آپ نے پچاس ہزار کو ختم کر دیا۔ طاعون نے جواب دیا۔ جی نہیں، میں نے تو پانچ ہزار ہی مارے۔ باقی محض خوف سے مرے ہیں!۔

خوف، فکر اور پریشانی سے ہر سال ہزاروں ہی مر رہے ہیں! کاش وہ یہ جان لیتے کہ کسی چیز کے خوف

کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ حکمتِ الٰہیہ کی تعلیم تو یہ ہے کہ اگر ہم بے خوف ہو جائیں تو ہماری زندگی میں کوئی چیز ایسی رُونما نہیں ہوتی جو ہمارے لیے خیرِ محض نہ ہو۔ کسی کو بیماری کا خوف ہوتا ہے تو کسی کو کاروبار میں ناکامی کا، اور وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ اپنے خوف ہی کی وجہ سے ان چیزوں کو اپنی طرف جذب کر رہے ہیں، جن سے کہ وہ خوف زدہ ہیں۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ افکار و خیالات بڑی قوت رکھتے ہیں، وہ زندہ ہیں، آسانی سے نہیں مرتے۔ وہ مماثل خیالات کو جذب کرتے ہیں اور قوی ارتعاشات پیدا کرتے ہیں۔ اب اگر ہمارا صحنِ قلب خوف کے خیالات سے پُر ہو تو ہم خوف میں ڈوب جاتے ہیں، ہماری زندگی تاریک ہو جاتی ہے اور ہمارا جسم نحیف اور کمزور ہو جاتا ہے۔ اپنے اطراف نظر ڈالو، تمہیں بہت سے چہرے ایسے دکھائی دیں گے، جو خوف اور پریشانی سے مسخ ہو رہے ہیں۔ خوف کی تباہ کاریوں نے اُن کی زندگی اجیرن کر دی ہے، وہ نہ زندہ ہی ہیں نہ مُردہ۔ دوزخ کے متعلق کہا گیا ہے کہ لوگ اس میں زندہ ہوں گے نہ مُردہ۔ "لَا یَمُوتُ فِیھَا وَلَا یَحْیٰی"۔ ہم میں سے اکثر کے لیے یہ زندگی دوزخ سے کچھ کم نہیں۔ یہ دو روزہ عمر خوف و خطر سے پُر ہے۔ خوف ہی کی وجہ سے خلق کی غذا خونِ جگر ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اِن لرزاں و ترساں ہستیوں سے کہا جائے کہ تمہیں کسی چیز سے خوف کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن جب تک کہ وہ وقتِ موعود نہیں آجاتا کہ وہ اس تنبیہ کو قبول کریں، وہ صداقت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ان سے اس قسم کی گفتگو کرو، وہ مضطربانہ انداز میں کہتے ہیں کہ جب تک ان کی صحت یا اُن کے حالات درست نہ ہو جائیں وہ خوف اور پریشانی سے رہائی پا نہیں سکتے۔ جب ہم جرأت کر کے ان سے کہتے ہیں کہ جو قوت تمہارے باطن میں ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو خارج میں ہے، یا یہ کہ تم اپنے ماحول سے زیادہ قوی و عظیم ہو تو اس کا انہیں مطلق یقین نہیں آتا، یا اگر ہم ان سے کہیں کہ تمہاری ساری مشکلات اور مصائب تمہارے ہی خیالات اور خوف کا نتیجہ ہیں تو وہ بے یقینی سے ہمارا مُنھ تکتے ہیں، لیکن اگر یہ بات اکثریت کے متعلق صحیح ہے تو تھوڑی سی اقلیت ایسی ہی پائی جاتی ہے، جو ہمارے اس پیغام کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہمیں اُن تک پہنچ کرنی چاہیے اور انہیں یہ کہہ دینا چاہیے کہ "تمہیں کسی چیز سے خوف کرنے کی مطلق ضرورت نہیں۔"

گرچہ رہ بیم ناک داری   اللہ معک چہ باک داری!

جو خوف پر غالب آنا جانتا ہے وہ خوف کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے اور خوف کے سلبی نتائج کو پیدا ہونے ہی نہیں دیتا۔ وہ بیماری، ناکامی، غم و حزن کو اپنی طرف جذب ہی نہیں کرتا۔ وہ دائرۂ حُریّت میں داخل ہو جاتا ہے۔

حریا آزاد ہوجاتا ہے، رقِ اغیار سے رہا ہوجاتا ہے۔ سلطان کون ہوجاتا ہے۔ وہ طمانیت وسکینت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ وجود کے ادنیٰ مراتب کے قوانین کے اثر سے ماورا ہوجاتا ہے۔

یاد رکھو کہ خوف رفع ہوتا ہے قُربِ حق کے ادراک سے، اسی ادراک میں زندگی بسر کرنے سے اور اس یقین کے پیدا کرنے سے کہ ہماری زندگی میں حق تعالیٰ ہی کی مُراد اور اُن ہی کے منشا کی تکمیل ہو رہی ہے اور یہ منشا و مراد خیر برترین ہے:

عمرِ خوش در قربِ جاں پروردن است　　　عمرِ زاغ از بہرِ سرگیں خوردن است　(رومی)

اب قُربِ حق کے دو پہلو ہیں، ایک رحمت کا، دوسرا حکمت کا۔

(ا) قُربِ حق رحمت ہے۔ رحمتِ حق ہمیں کوئی گزند یا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ نہ نقصان پہنچانا چاہتی ہے اور نہ غیر کو نقصان پہنچانے دیتی ہے۔ حق تعالیٰ رؤف و رحیم ہیں، حلیم و کریم ہیں، ہمیں سلامتی، امن و عافیت ہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ان کا فضل و کرم عظیم ہے، وہ ہمارے ولی و نصیر ہیں۔ اگر ہم اس بنیادی واقعہ کو یاد رکھیں، بھُلا نہ دیں۔ اُن کے سایۂ رحمت میں زندگی بسر کریں۔ اُن کے قوی و توانا بازوں پر بھروسہ کریں اور ان کی یاد میں رہیں تو کوئی چیز ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی، کیوں کہ رحمتِ حق کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ حق کے مقابلہ میں کون سی قوت ٹھہر سکتی ہے، لیکن افسوس صرف اس بات کا ہے کہ ہماری زندگی ذہول و غفلت میں گزرتی ہے، معصیت و نافرمانی میں بسر ہوتی ہے۔ زاغ و زغن کی طرح۔ بقول مولانا روم "سرگین خوردن" یا گو کھانے میں صرف ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ یارِ مہربان کی طرح ہمارے جویا ہیں اور ہم گدھوں کی طرح ان سے بھاگتے ہیں اور خوف و حزن اور بلاؤں و آفتوں کا شکار ہوتے ہیں:

تو مرا جویا چو یارِ مہرباں　　　من گریزاں از تو مانندِ خراں　(رومی)

جب خوف و حُزن، آفات و بلیات کا سامنا ہو، طوفان ہمیں گھیرلے اور ہم قُربِ حق کا ادراک قائم کر سکیں، قلب کو اس واقعہ کا یقین دلا سکیں کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، اپنی رحمتِ کاملہ کے ساتھ ہمارے قریب ہیں، مونس و رفیق ہیں، ہماری قوتِ بازو اور ہماری پناہ گاہ ہیں، سہارا ہیں، وہی حق تعالیٰ جن کے حضور میں رات کی سیاہی اور دن کی روشنی، آفتاب کی شعاعیں اور چاند کا نور، درخت کے جان دار اور پانی کے حیوان سجدہ ریز ہیں،

جو محسن و منعم و مکرم ہیں، جو حرزِ ضعفا اور کنزِ فقرا ہیں، تو بھلا بتاؤ کہ اس ادراک کے بعد قلب میں خوف باقی بھی رہ سکتا ہے ؛ حاشا کلّا۔ قرآنِ کریم نے ببانگِ دُہل اعلان کیا ہے کہ اس ادراک یا ذکر یا یاد کے بعد قلب کا اطمینان وسکون قطعی و یقینی ہے :

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب   خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

"ذکر" "توجہ قلبی" ہی کا تو نام ہے۔ حق تعالیٰ کی طرف، اُن کی رحمت و رافت و محبت کی طرف قلب نے توجہ کی، اس امر کا ادراک کیا کہ یہ رحمت ہم پر ہر جانب سے محیط ہے کہ خوف دُور ہو اور طمانیت نصیب ہو اور زندگی کے میدان میں قدم اعتماد و اطمینان کے ساتھ بڑھنے لگے۔ اب ہم نے محسوس کر لیا اور ہمیں یقین ہو گیا کہ رحمتِ حق ہم پر محیط ہے، کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا! لیکن خوف و خطر کے وقت رحمتِ حق کا ادراک و تحضر کوئی ایسی چیز نہیں جو سہولت کے ساتھ حاصل ہو۔ اگر ہم نے راحت و فراغت کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا ادراک قائم نہ رکھا ہو تو خوف و مصیبت کے وقت ہم اس کی معیت کا ادراک کر نہیں سکتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں نہایت بے رحمی کے ساتھ دشمن کے حوالہ کر دیا گیا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی توجہ ہر حالت میں، خواہ وہ نعمت و راحت کی ہو یا بلا و مصیبت کی، حق تعالیٰ کی جانب لگائے رکھیں، ان کی یاد میں زندگی بسر کریں، ان کی معیت کا ادراک کرتے رہیں، اس لیے حضور انور صلعم نے ابنِ عباس رضؓ کو نصیحت فرمائی تھی کہ :

اذکر اللہ فی الرخاء یذکرک فی الشدۃ   اللہ کی یاد چین اور آسودگی کی حالت میں کر وہ تجھ کو سختی کی حالت میں یاد کرے گا (یعنی تیری مصیبت یا سختی کو دور کر دے گا)۔

خوف کے وقت حقیقی دُعا تو یہ ہے کہ ہم اپنی حقیقت میں ڈوب جائیں اور کہیں "حق تعالیٰ میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں۔ میں آپ کی نظروں میں ہوں"۔ پھر کوشش اس امر کے ادراک کی کی جائے کہ ہم حق تعالیٰ کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور اُن کی رحمتِ کاملہ اور نعمتِ سابقہ ہم پر بادل کی طرح سایہ فگن ہے، یا نُور کی طرح ہر جانب سے ہم پر محیط۔ خوف کا کامل علاج بس یہی مراقبہ ہے۔

خوف و بلا کے ورود کے وقت قرآن شاہد ہے کہ پیغمبرِ اسلام (فداہ روحی) کو حکم ہوا کہ :

فاصبر لحکم ربّک فانک باعیننا   اپنے رب کے حکم پر صبر کرو کہ تم ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔

بعض عارفین کی جیب میں یہ آیت کریمہ لکھی رہتی تھی۔ وہ خوف و مصیبت کے وقت اُس پر نظر ڈالتے، حضور و معیتِ حق کا ادراک کرتے اور محض اس شعور و ادراک سے کہ حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت کو جانتے ہیں، اس تجربہ میں شریک، ہمیں دیکھ رہے ہیں، مستیٔ عشق سے جھومتے! کہا جاتا ہے کہ خود حضورِ انور صلعم پر اس آیت سے وجد طاری ہوا تھا اور اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ آپ کے پاؤں پر گرگئی تھیں! جامی نے شاید اسی احساس کو یوں ادا کیا ہے:

با درد بساز چوں دوائے تو منم — در کس منگر کہ آشنائے تو منم!

گر بر سرِ کوئے عشق ما کشتہ شوق — شکرانہ بدہ کہ خوں بہائے تو منم

زندگی کا ہر تجربہ، ہر واقعہ ہمیں خیرِ محض کی طرف لے جا رہا ہے۔ تصادم کی بجائے اس سے توافق ہی سب سے بڑی عقل مندی ہے۔ رضا بالقضا اسی کو کہا جاتا ہے "ہماری زندگی میں کوئی حادثہ نہیں نازل ہوتا، مگر وہی جو حق تعالیٰ نے ہمارے لیے مقرر فرمایا ہو۔ وہ ہمارے مولیٰ ہیں، ہمیں اپنے سب کام اُن ہی کے سپرد کر دینے چاہییں" (قرآن) جذبۂ شکر و امتنان سے ساختِ قلب کو مملو کر رکھنا چاہیے۔ اُن کی مرضی کو اپنی مرضیات پر مقدم رکھنا چاہیے۔ نفس و ہوا کی کاملاً و شاملاً نفی کر دینا چاہیے۔

شاد و خنداں پیش تیغش سر بنہ — ہم چو اسمٰعیل پیشش سر بنہ! (رومی)

(۲) ثانیاً قربِ حق یا حضورِ حق حکمت و نظم کا نام ہے۔ نظمِ کائنات پر غور کرو۔ یہاں پر ایک زبردست قانون عمل کر رہا ہے۔ اس کی شکست یا ناکامی ناممکن ہے۔ مثلاً کوئی برقیہ (ELECTRON) تک اپنے کام میں تصور نہیں کرتا۔ دوسرے برقیہ سے نہیں ٹکراتا۔ ان کے درمیان تصادم ممکن نہیں، یا قرآن کے الفاظ میں یوں کہو کہ "خلق رحمٰن" میں کوئی "تفاوت" نہیں، یا صنعِ الٰہی میں خلل نظر نہیں آتا۔ بار بار نگاہ ڈالنے پر بھی نگاہ درماندہ ہو کر لوٹتی ہے اور کوئی عیب و خلل نظر نہیں پڑتا! نظمِ الٰہی میں کامل توافق یا ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ نغمۂ موسیقی جن تاروں سے پیدا ہوتا ہے، ہر تار اپنی مقررہ شرح ہی سے مرتعش ہوتا ہے۔ اس کی رفتار میں کمی و بیشی نہیں ہوتی۔ نظمِ الٰہی کا یہی حال ہے۔ یہاں بھی ہر شے ٹھیک ٹھیک ہوتی ہے۔ اپنے صحیح مقام پر ہوتی ہے، اپنا مفوضہ کام انجام دیتی ہے، اس کو کامل طور پر انجام دیتی ہے اور اپنے صحیح وقت پر انجام دیتی ہے۔ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ۔

اب قربِ حق کے مفہوم میں نظمِ الٰہی بھی شامل ہے اور چوں کہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہمارے قریب ہیں، اقرب ہیں،

محیط ہیں، ساتھ ہیں، نظمِ الٰہی، حکمتِ حق بھی اس کے ساتھ ہی موجود ہے۔ اگر ہم اس کا ادراک رکھیں اور اس پر بھروسہ کریں تو اس کا ظہور بھی ہمارے معاملات میں قطعاً ہوگا۔ یہاں ہمیں شک و شبہ میں مبتلا نہ ہونا چاہیے۔ ایمان کی شاہانہ قوت کو کام میں لانا چاہیے، کیوں کہ:

ہر کہ در شک است او خود کودک است — مرد آں باشد کہ بیرون از شک است (رومی)

جب ہم اپنی دعا میں کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں تو ہمیں اس امر کا تحقق ہونا چاہیے کہ معیتِ حق نہ صرف رحمت ہے، بلکہ حکمت بھی ہے، نظم بھی ہے، لہٰذا ہر شے ٹھیک ٹھیک ہوگی اور اپنے ٹھیک وقت اور ٹھیک مقام پر ہوگی اور اگر ہم اس یقینِ صادق کو قلب سے ہٹنے نہ دیں، (اور اسی کو ہمت کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے) تو پھر سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا۔

اگر دل سے حکمتِ الٰہی نظر آنے لگے، اگر دل نظمِ الٰہی کا مشاہدہ کرنے لگے، اس حضور و شہود میں قائم رہے تو پھر عارف کا ہر کام پسندیدہ ہی ہوگا، اپنے وقت پر ہوگا، اپنے مقام پر ہوگا اور ہر وقت وہ یہی کہے گا کہ "الخیر فیما وقع" جو ہوا سو ٹھیک ہوا:

ہر چیز کہ ہست آں چناں می باید — واں چیز کہ آں چناں نمی باید نیست

نہ صرف یہ کہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہمارے ساتھ ہیں۔ اللّٰہُمَّ مَعَنَا، بلکہ ہر زندگی میں منشائے الٰہی ہی کی تکمیل ہو رہی ہے۔ ہمارے قلوب، ہمارے اعضاء اور ہم خود سراپا حق تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہیں۔ اس منشائے الٰہی کی بنیاد نامتناہی حکمت و رحمت پر قائم ہے۔ یہ سراپا حکمت ہے، رحمت ہے۔ یہ ہمیں خیر برتر ہی کی طرف لے جا رہی ہے اس کو "ارادۃ اللہ" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ "مرضیٔ مولیٰ" بھی کہا گیا ہے۔ حق تعالیٰ کے ارادہ سے توافق، اُن کی رضا سے راضی ہونا، رضا از دُ رضا بدرو، رضا در و، اعراض عن الاعتراض، حفظِ حال، قیام فیما اقام اللہ، اس کی تعلیم تو ہمارے رہبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دی ہے۔ غور کرو حق تعالیٰ کے ارادے، منشاء مرضی سے زیادہ بہتر، زیادہ نفیس، زیادہ حسین و جمیل، زیادہ شان دار کوئی چیز ہو بھی سکتی ہے؟ نیک انجام و شاد کام، خوف و حزن سے فارغ و ناآشنا ہے وہ شخص، جس نے اپنے ارادہ سے حق تعالیٰ کے ارادہ کے خلاف کام نہ لینے کا ارادہ کر لیا اور بہ آوازِ بلند کہا:

اُرِیْدُ اَنْ لَّا اُرِیْدُ — میں نے ارادہ نہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

جب ہم حق تعالیٰ کے ہاتھوں میں اپنے آپ کو دے دیتے ہیں، نرم اور ملائم اور لچکیلے ہو جاتے ہیں، اُن کے ارادہ کے آگے شاد و خنداں سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں، اُن کی رضا سے راضی اور غضب سے غضب ناک ہو جاتے ہیں تو پھر حق تعالیٰ بھی ہماری رضا سے راضی اور غضب سے غضب ناک ہو جاتے ہیں۔ زبانِ وحی نے بھی اس کی توثیق کی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ رِجالاً یرضٰی برضاھم ویغضب بغضبھم کما انّھم یرضوا برضائہ ویغضبوا بغضبہ

اس مفہوم کو کسی مردِ حق نے اس شعر میں یوں ادا کیا ہے:

ہر چہ خواہی آن کند گو ہر چہ خواہد آں کنی   آنچہ گوئی بشنود گو ہر چہ گفت او بشنوی

جب مقامِ رضا کی تکمیل ہو جاتی ہے تو پھر ہمیں پروا نہیں رہتی کہ زندگی میں ہم پر کیا گزر رہی ہے، یا گزرنے والی ہے، کیوں کہ ہم قوتِ ایمانیہ کی بداہتِ شاہانہ سے جاننے لگتے ہیں کہ انجام ہر چیز کا خیر ہے، خیر اب بھی اور ہمیشہ کے لیے بھی، کیوں کہ رضا کی وجہ سے حق تعالیٰ اپنے بندہ سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جس سے وہ محبت کرتے ہیں اُس کو نہ دنیا میں تکلیف دیتے ہیں، نہ آخرت میں۔ (شیخ جیلی رحمت در فتوح الغیب)

قربِ حق میں زندگی بسر کرنے اور اس امر پر یقینِ صادق حاصل کرنے کا کہ ہماری زندگی میں مرادِ الٰہی کی تکمیل ہو رہی ہے، نتیجہ خوف، پریشانی، فکر اور بے شمار خرابیوں اور بیماریوں کا کامل دفعیہ ہے۔ ہم کو اس طرح اس عارفِ کامل کا نقطۂ نظر حاصل ہو جاتا ہے، جو زندگی اور اس کے ہموم و غموم، افکار اور پریشانیوں پر ہنستے ہوئے نظر ڈالتا ہے اور ہر حالت میں ہشاش و بشاش و بسام رہتا ہے، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ پسِ پردہ حکمتِ مطلقہ و رحمتِ مطلقہ کام کر رہی ہے اور اپنے شان دار منشا و مراد کی تکمیل کر رہی ہے اور ہمیں خیرِ برتر کی طرف لے جا رہی ہے۔ سارے جہاں کو بھی اگر وہ برف سے ڈھکا ہوا دیکھتا ہے تو گھبراتا نہیں، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ خورشید کی نظر سے یہ ساری برف پگھل جائے گی:

گر جہاں پر برف گردد سر بسر   تابِ خور بگدازدش از یک نظر   (رومی)

اس لیے وہ اپنے ساتھیوں سے عجیب اُمید افزا لہجہ میں کہتا ہے:

سوئے نومیدی مرو کامید ہاست   سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

مختصر یہ کہ میں اپنے مریض سے کہتا کہ تمہیں خوف سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے، اس کے لیے تمہیں چاہیے کہ:

(۱) قُربِ حق میں اپنی زندگی بسر کرو، کیوں کہ :

عمرِ خوش در قربِ جاں پروردن است　　　عمرِ زاغ از بہرِ سرگین خوردن است

(۲) حق تعالیٰ کے ہاتھوں میں نرم اور مُلائم بن جاؤ، تاکہ ارادۂ اللہ جاری ہو جائے۔ شعوری تصادم باقی نہ رہے۔ رضائے حق تمہارا مقام ہو۔ حق تعالیٰ نے جہاں تمہیں کھڑا کیا ہے وہیں کھڑے رہو۔ (قیام فی ما اقام اللہ) رضا بالعطا، حفظِ حال تمہارا شیوہ ہو۔ ہر حال میں راضی رہو۔ تصادم بالقضا سے بچو۔ جن تجربات سے گُزر رہے ہو اُن پر خدا کا شکر کرتے رہو کہ ان کا تمہیں موقع دیا گیا۔ یاد رکھو کہ ان ہی سے سیرت کی تکمیل ہوتی ہے۔ دنیا کو "رُوح ساز وادی" کہا گیا ہے۔ یہاں کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت کے خفتہ نغمے بیدار کیے جاتے ہیں، ان پر ہر حال میں شُکر واجب ہے۔ کرب و طرب دونوں کی ایک سی قیمت ہے۔ بہ الفاظِ دیگر جن چیزوں سے خوف ہو اُن ہی سے پیار کرو تو خوف سے تمہیں ہمیشہ کے لیے نجات مِل جائے گی اور تم "زمرۂ لایحزنون" میں شامل ہو جاؤ گے :

بس زبون وسوسہ باشی دلا　　　گر طرب را باز دانی از بلا

(۳) میرا تیسرا سوال یہ ہوگا: "کس قسم کے خیالات پر تمہارا ذہن مرکوز رہتا ہے؟" عام طور پر لوگ اس سے واقف نہیں ہوتے کہ سلبی، دنی اور رذیل خیالات سے صحت اور جسم کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ اگر اس صداقت کا زیادہ لوگوں کو علم ہوتا تو وہ جو جہل کی وجہ سے گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں، اپنے خیالات کو زیادہ قید و ضبط میں رکھنے کی کوشش کرتے۔ رذیل و سفِل خیالات پر توجہ کو مرکوز کرنا نہ صرف اعمالِ سیئہ کو پیدا کرتا ہے، یہ صحت کے لیے بھی نہایت تباہ کُن ہے۔ یہ خیالات جسم کی کیفیت کو ضعیف کر دیتے ہیں اور اُس کی قوّتِ مزاحمت کو کمزور بنا دیتے ہیں۔ بیماری کا خیال کرنا، یاس و قنوط میں گرفتار ہو جانا، چیزوں کے تاریک پہلو پر نظر کو جمانا، دوسروں میں شر کے پہلو کو دیکھنا بجائے ان کی جہتِ خیر پر توجہ کرنے کے زندگی کے درد و غم ہی کو پیشِ نظر رکھنا، جسم میں ایک فاسد یا سقیم حالت کو پیدا کرتا ہے اور ناقابلِ علاج بیماریوں کے میلان کو جنم دیتا ہے۔ اطبا تمہیں یہ بتلائیں گے کہ اُن کے مریضوں میں وہی لوگ جلد شفایاب ہو جاتے ہیں جو زندگی کے روشن پہلوؤں پر نگاہ رکھتے ہیں، جو خیر کے جویا ہوتے ہیں اور شر سے گریزاں، جو زندگی کے واقعات میں حسن و احسان کا مشاہدہ کرتے ہیں اور رؤیتِ نعیم سے متلذذ ہوتے رہتے ہیں۔ ناملائمِ طبع اور قہریات سے بھی خیر و لطف ہی کے معنی کا استنبار کیا کرتے ہیں۔ چند سال قبل میں نے چند ذہین افراد سے اس

قسم کی کچھ باتیں کہیں۔ جب میں ختم کر چکا تو ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا کہ وہ حال ہی میں ایک ہسپتال میں علاج کے لیے رہ چکا ہے۔ جب وہ دواخانہ میں رجوع ہوا تھا تو وہاں ایک نوجوان بھی اسی قسم کے مرض میں مبتلا پڑا تھا۔ چند ہی روز میں وہ تو اچھا ہو کر نکل آیا، لیکن اس نوجوان کی وہی حالت رہی۔ جب ڈاکٹر سے پوچھا گیا کہ یہ کیا بات ہے کہ ایک مریض تو اس قدر جلد اچھا ہو جاتا ہے اور دوسرا جو اسی قسم کے مرض میں مبتلا ہے اچھا نہیں ہوتا؟۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ان میں سے ایک رجائیت پسند ہے اور دوسرا قنوطی۔ پہلے نے اپنی رجائیت کی وجہ سے صحت حاصل کی اور دوسرے کو اس کی قنوطیت نے شفایابی سے محروم کر رکھا ہے۔

جب تمہیں بیماری کے تجربہ کا اتفاق ہوتا ہے تو تم فطرتاً غم و اندوہ میں مبتلا ہو جاتے ہو، اپنے نقصانات اور ناکامیوں کی سوچ میں گرفتار ہو جاتے ہو، تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ تمہاری یہ حالت تمہاری زندگی سے خیر کو تو یکسر دفع کر چھوڑتی ہے، لیکن شر کی تمام انواع کو جذب کر لیتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر تم مبدارِ حیات کے متعلق حُسنِ ظن سے کام لو اور فرح و انبساط کی عادت پیدا کرو تو یقین جانو کہ خیر کی ہر صورت جذب ہو کر تمہاری طرف اضطراراً رجوع ہوگی اور تمہارے جسم میں نامعلوم مبدار سے قوتِ حیات کا وفور ہوگا، جو بیماری کے نام و نشان تک کو مٹا چھوڑے گی، اسی لیے اس دُعائے ماثورہ کو "دعاء الشفا" کہا گیا ہے:

سبحانك ما اکرمك وجلالی ما اعلمك	پاک ہے تو اور کس قدر عزت والا اور میرے حال کا کس قدر دانا،
وعلی فرجی ما اقدرك۔ انت ثقتی ورجای	میرے غم کو دور کرنے پر کتنا قادر، تو میرا بھروسا اور امید ہے، تیرے متعلق
اجعل حسن ظنی فیك دوائی!	میرے حُسنِ ظن کو میری دوا کر دے۔

اگر اس دعا کے الفاظ کا مصداق قلب کی کیفیت ہو جائے اور مبدارِ حیات کو کریم و علیم و قدیر جان کر اس پر بھروسہ کیا جائے اور ہر حال میں یہ حُسنِ ظن رکھا جائے کہ وہ ہمیں خیر برتر ہی کی طرف رہنمائی کر رہا ہے تو شر کی ظاہری صورتیں ہی خیر کے حصول کا باعث ہو جاتی ہیں۔ یہ روحانی زندگی کا ایک عمیق راز ہے۔ ع:

ایں خانہ رسد زورق ہر سودائی

جب لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کے اجسام کروڑوں دقیق و رقیق زندہ مخلوقات سے مرکب ہیں اور ان میں سے ہر ایک شعور کی صفت سے موصوف ہے اور یہ جماعتی ذہن کے زیرِ تصرف ہیں اور ان جماعتی ذہنوں پر

تحت الشعور ذہن تصرف کر رہا ہے اور یہ ان خیالات سے متاثر ہوتا ہے: جو ہمارے شعوری ذہن میں خطور کیا کرتے ہیں تو وہ ضرور اس امر کی سعی کریں گے کہ اپنے خیالات پر ضبط رکھیں۔ جب تک انہیں یہ علم نہ پہنچایا جائے وہ ضرور بیمار، رنجور اور مریض رہیں گے۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان لوگوں تک اس پیغام کو پہنچا دیں، جو اس کو سننے اور ماننے کے لیے تیار ہیں۔ اس تحریر کے پڑھنے والے کا فرض ہے کہ دوسروں کو یہ بتلائے کہ وہ اپنے خیالات پر حکمراں ہو کر اپنے جسم کو تندرست رکھ سکتے ہیں۔ صحت و بیماری کا معاملہ بھی زندگی کے دوسرے معاملات کی طرح علم و جہل ہی سے بنتا اور بگڑتا ہے۔

سحابی استرآبادی نے اس حقیقت کو ایک عرصہ پہلے ہی دریافت کر لیا تھا:

کامل گوید جہان تمام و اہل است ناقص گوید کہ کوتہ است و سہل است

شطرنج ہماں عرصہ ہماں رخت جہاں این بردن و باختن ز علم و جہل است

جب تک یہ علم عام نہیں ہو جاتا ہمیں شفاخانوں اور پناہ گاہوں کو قائم و باقی رکھنا پڑے گا اور اطبا کو مادی دوائیں پہنچانی پڑیں گی، لیکن جب لوگ اس علم سے واقف اور اس پر عامل ہو جائیں گے تو پھر ان چیزوں کے محتاج نہ رہیں گے اور اگر رہیں گے بھی تو بہت کم:

مردم اندر حسرتِ فہمِ درست این کرمی گویم بقدر فہمِ تست

اگر میں طبیب ہوتا تو میں اپنے بیمار سے یہ سوالات کرتا اور اس کے جواب کے مطابق اس کو سمجھاتا کہ اس کو ذہنی زندگی کی تعمیر ایک نئی اساس پر کس طرح کرنی چاہیے اور طبعاً اپنے جسم کی تجدید کس طرح کرنی چاہیے۔ بہت ممکن ہے کہ مجھے معاوضہ میں ایک حبہ بھی نہ ملتا اور اس کا بھی احتمال ہے کہ مجھے دو چار گالیاں دی جائیں اور کہا جاتا کہ پھر اس طرف رُخ نہ کروں۔ ہر صورت میں مجھے مریض ہی سے ہاتھ دھو لینا پڑتا، اسی لیے ہم اطبائے اس کام کی توقع ہی نہیں کرسکتے۔ انہیں تو ہزاروں مریضوں کا معائنہ کرنا پڑتا ہے جو صرف شفایابی کے مادی طریقوں پر ایقان رکھتے ہیں اور فی الحال ان ہی طریقوں کو سمجھ بھی سکتے ہیں۔ روحانی یا ذہنی شفابخشی کا کام تو دوسروں ہی کو کرنا ہوگا۔

محرمِ دولت بنوہ ہر سرے بارِ مسیحانہ کشد ہر خرے

انڈین فائن آرٹ پریس قاسم جان اسٹریٹ دہلی